محمد مصطفےٰ

حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی کے کلام پر تنقیدی جائزہ

محاسنِ کلامِ محمود

اختر گوبند پوری

نے جسے بزمِ فروغِ اردو لاہور میں پڑھا تھا



دارالتجلید اردو بازار ——— لاہور

۱۴ ملکانی محل۔ فریئر روڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۵، کراچی ۳

حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی کے کلام پر تنقیدی جائزہ

محاسنِ کلامِ محمودؔ

اختر گوبند پوری

نے جسے بزم فروغ اردو لاہور میں برائے تنقید و تبصرہ پیش کیا

شایع کردہ

دار التجلید اردو بازار لاہور

قیمت ۸ آنے

بار اول

گلزار عالم پریس بیرون بھاٹی دروازہ لاہور میں چھپوا کر سید محمد سعید سلیم نے اردو بازار سے شائع کیا۔

فہرس

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	اظہار تشکر	۵
۲	تعارف	۶
۳	مقام محمود	۸
۴	کلام محمود کا مقام اردو شاعری میں	۹
۵	اخلاقی اور اصلاحی شاعری کے بنیادی مسائل	۱۵
۶	سیدنا محمود کا مشاہدہ و مطالعہ	۱۷
۷	پیرایۂ تبلیغ و ہدایت	۲۳
۸	ایمان محکم، یقین مکمل، عمل پیہم	۳۱
۹	کلام محمود کی فنی خوبیاں	۳۶
۱۰	کلام محمود کی ادبی خوبیاں	۴۶
۱۱	کلام میں علم معرفت و حقیقت	۵۳
۱۲	خود اعتمادی	۶۱
۱۳	مدعا	۶۴

اظہارِ تشکّر

مکتبہ دار التجلید، بزم فروغ اردو لاہور کا بے حد ممنون و متشکر ہے کہ جس نے مکتبہ مذکور کو جناب اختر گوبند پوری کا لکھا ہوا مقالہ بعنوان محاسن کلام محمود جو کہ انہوں نے بزم فروغ اردو میں بغرض تنقید و تبصرہ پیش فرمایا تھا کو اس غرض سے ہمیں عطا فرمایا کہ ہم اس کی اشاعت سے جہاں اہل ادب حضرات تک اس کو شائع کر کے پہنچائیں، وہاں اس سے ان حضرات کی تشنگی دور کرنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوں، جن کی عقیدتیں اس سے وابستہ ہیں۔

اگرچہ بزم فروغ اردو لاہور نے ہمیں اس کی صرف ایک ہزار کاپیوں کی اشاعت کی اجازت دی ہے۔ بہر حال یہ احسان بھی کم نہیں جو اس دور میں بے غرض اور بے لوث خدمت بزم مذکور نے کی یعنی بلا کسی معاوضہ اس مقالہ کو شائع کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

مکتبہ دار التجلید کے پیش نظر بھی اس مقالہ کی اشاعت میں کوئی مالی منفعت مقصود نہیں۔ صرف اس مقالہ کی اشاعت کا محض خرچ پورا کرنا ہی مقصد ہے۔ اسی لئے اس ہوشربا گرانی کے دور میں عمدہ کتابت، چھپائی، سرورق کے باوجود اس کی قیمت نہایت واجبی سی ہے۔ جس سے کہ اس مقالہ کی اشاعت کے اخراجات ہی پورے ہو سکیں اور بس۔

سیّد محمد سعید سلیم

تعارف

علامہ لطیف انور صاحب

لاہور کے ادبی حلقوں میں اختر گوبندپوری کا نام یقیناً کوئی نیا نام نہیں ہے۔ وہ نوجوان شعرا کی صف میں بہت تیزی سے نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اس کی شعری رفتار اسی طرح رہی۔ تو بہ وثوق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادبی دنیا میں اپنے لئے بہت جلد ایک مقام تلاش کر لے گا۔

میں اُسے جب سے جانتا اور پہچانتا ہوں جب وہ محض ایک کھلنڈرا سا لڑکا تھا۔ وہ میرے سامنے شعر کی دنیا میں داخل ہوا۔ اس کی ساری شعری نشوونما میرے سامنے ہوئی ہے اس لئے میں اپنی رائے پر بھروسہ کرتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا دل اور اس کا دماغ دونوں شاعرانہ ہیں اور اگر اُس کی شاعری اُس کے کھلنڈرے پن سے محفوظ رہی تو وہ اردو زبان کے نوجوان شاعروں میں کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

سری گوبندپور تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور (یاد ش بخیر) ایک پُر فضا مقام تھا۔ دریائے بیاس اُس کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ چونکہ "انسانی آبادی" کی ابتدا دریاؤں کے کناروں سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ ذہن جن کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو۔ انسانی ارتقا کے مسائل کو بہت حد تک کامیابی سے سمجھتے ہیں۔

اختر کا بچپن اور جوانی کی ابتدا چونکہ ایک ایسے ہی ماحول کی پروردہ ہے۔ اس لئے اُس کی شاعری انسانی مسائل اور نکات کی اکثر حامل ہوتی ہے۔

ابھی وہ نوجوان ہے۔ ابھی زندگی کے بہت سے تلخ اور شیریں تجربے اور ان کا

ردعمل اس کے شعری مواد میں اضافے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں یہاں اُس کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ دینے کو مناسب نہیں سمجھتا۔ بہرصورت میری اور میری طرح اردو ادب و شعر کی بہت سی خوشگوار امیدیں اس سے وابستہ ہیں ؂

لاہور

۱۹ر دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء

مقامِ محمود

حضرات!

حضرت مسیح موعود مرزا غلام احمد صاحب بانی سلسلہ احمدیہ کے مبشر فرزند اور جماعت کے موجودہ امام حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ادبی تخلیقات سے اہلِ ذوق کما حقہ آشنا نہیں ہیں۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ کسی مفکر و مبصر نے حضور کے صحت اور خیالات کے بارے میں خامہ فرسائی نہیں کی۔ انسانی ضابطہ حیات کے متعلق آپ کے فرمودات قابلِ ہزار ستائش ہیں۔ آپ نے زبانِ شعر میں عقدہ ہائے زیست کا صحیح حل پیش کیا ہے۔ دامنِ انسانیت پر آپ کے جواہر پارے ہمیشہ ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔ بحیثیت ایک تبصرہ نگار کے مجھے یہ لکھتے ہوئے مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ دینی علوم کے علاوہ حضور کا ادبی مقام بھی بہت بلند ہے۔

حلقہ بگوشانِ ادب شعر کو الہام کا ہم پلہ گردانتے ہیں۔ یہ جامد حقیقت حضور کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے میں مکمل ذہنی ایمانداری کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنے مذہبی خیالات کی طرفداری سے بالکل الگ ہٹ کر سمجھتا ہوں کہ حضور کی عظیم شخصیت نے شعر و سخن کے وقار میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے

وقتی مصلحتوں کی بنا پر میں حضور کے کلام کے ایک حصہ پر بحث نہیں کر سکا۔ مجھے اس سلسلہ میں افسوس کے ساتھ ساتھ مجبوری حالات و وقت کا بھی احساس ہے۔ اس فرض کو کسی اور موقع پر اٹھا رکھتا ہوں:

خاکپائے محمود

اختر گوبند پوری

کلامِ محمود کا مقام اردو شاعری میں

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کی بحث ایک طویل دور سے گذر کر ایک فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ چکی ہے۔ کائنات کے اس سنہری دور میں جب سائنس کے ارتقاء سے انسان تسخیرِ فطرت پر تلا ہوا ہے۔ جب ہر کاہ کا بھی عالمِ انسانی میں مقام متعین کیا جاتا ہے۔ جب انسانی افعال کی کڑی نگرانی ہونے لگی ہے اور انسان کی ایک معمولی سی حرکت پر بھی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اس دور میں جبکہ انسان اپنی روحانی اور جسمانی۔ دینی اور دنیاوی خوشحالی اور ترقی کے لئے جدوجہد میں مشغول ہے۔ کسی انسان کو کسی بے مقصد[1] کام سے باز نہ رکھنا خود انسان کی اجتماعی جدوجہد اور نئی اقدارِ حیات کو محروم کرنے کے مترادف ہے۔

ہماری قوم نے ہمیشہ غلامی کی زندگی بسر کی ہے۔ نہ دورِ مغلیہ میں آزادی ایسی نعمتِ غیر مترقبہ سے ہم آغوش تھی۔ اور نہ انگریزوں کی شہنشاہی کے زیرِ سایہ اس نے آزادی کا مزہ چکھا۔ کبھی کبھی عوام کی سیاسی زندگی میں ایک ابال سا آجاتا تھا جس کا ردِ عمل بے حد جامد اور ساکت اور موت کی سی خاموشی۔ بے حرکتی اور بے عملی کا آئینہ دار ہوا کرتا

---

[1] مقصد کا جہاں کہیں استعمال ہوگا۔ اعلیٰ دینی اور دنیوی مقصد کے معنوں میں ہوگا۔

تھا۔ اسی ردعمل کے انحطاطی دور میں ادب برائے ادب کا نعرہ سسکتا تھا۔ اور وظیفہ خوار شاعر اور ضمیر فروش ادیب قنوطیوں، قصیدوں، ہجووں اور غزلوں کے انبار لگا دیتے تھے گویا قبرستان سے موت جنم لیتی تھی، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مگر ہے آخری دموں پر!!

رفتہ رفتہ لوگوں کے شعور اور وجدان میں انقلاب آیا۔ وہ حیات کی نئی اقدار سے روشناس ہوئے۔ انہوں نے بے عملی کی زندگی کو خیر باد کہہ کر عمل کے میدان میں گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے اور آج اس نئی دنیا کے سامنے اگر کوئی انسان ادب برائے ادب کا نعرہ لگاتا ہے۔ تو عام طور پر اس کے دماغ پر شک ہونے لگتا ہے۔ اور اسے انسانی معاشرے کے اس ترقی پسند دور کے لئے تباہ کن قرار دے کر متنفر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

ادب برائے زندگی کو بے شک دوسرے لفظوں میں ادب برائے مقصد کہا جا سکتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا سہارا لے کر بے عملی کا شکار ادیب اور گرتی ہوئی رجعت پسند دیواریں زندگی کی صالح اقدار کے نقیبوں پر آوازے کسنے لگتی ہیں۔ لیکن ان سے جب یہ درخواست کی جائے کہ آؤ مقصد کا تعین کر لیں۔ تو چور کو اپنی داڑھی میں تنکے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر دوبارہ بے عملی کے سرد خانوں اور ذہنی ضلالت کی عمیق ترین غاروں میں جا چھپتے ہیں۔

مقصد پرستی ادبی دنیا میں بے حد جرم ہے۔ لیکن ہمیں مقاصد کا تجزیہ کرنے پر پتہ چلے گا۔ کہ کون سے مقاصد کی پرستش انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔ اور کون سے مقاصد کی علمبرداری انسان کو مصلحیت اور مجددین کی شہ نشینوں پر لا بٹھاتی ہے۔

عیاش نوابوں اور جاگیرداروں نے ایک عرصہ تک اردو ادیبوں کا استحصال روا رکھا ہے۔ وہ اُدبا رو شعرا چند ٹکوں کے ماہوار مشاہرہ پر ان نوابوں اور جاگیرداروں کی مدح کرتے تھے۔ ان کے ہر عیب کو ہنر اور ہر رذالت کو شرافت کا نام دیتے تھے۔ ان کی رنگین طبیعتوں کے گرتے ہوئے میناروں کو عشقیہ مثنویوں اور ریختی کے اشعار سے سنبھالا دیتے تھے۔ سعادت یار خاں رنگین۔ انشا وغیرہ کے دواوین اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ شرمناک افعال کی متحرک تصویریں بے غیرتی کے کلمات۔ بے شرمی کے اشعار کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ان شعرا نے ایسے ایسے مضامین نظم کئے جو آج کی سوسائٹی تو کجا خود ان کے دور کے سماج کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ اگر اس مقالے کی موضوعی حیثیت مانع نہ ہوتی تو اس دور کے ادب کے بے شمار نمونے پیش کئے جا سکتے تھے۔ البتہ ذیل میں محمد ابراہیم ذوق کے قصائد میں سے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ جو اس نام نہاد استاد ادب اور استاد شاہ کی ذہنی بے راہ روی کی نہایت افسوسناک مثالیں ہیں ؎

پابوس تیرے پا سے جس ذرہ کو ذری ہو
وہ آسماں پہ جا کر خورشید خاوری ہو

وہ جبین ماہ جبین اُس پہ خطِ چینِ جبیں
تھی وہ انگشت نبی جس نے کیا ماہ کو شق[1]

اور پھر یہاں تک بڑھتا ہے ؎

تو کرسی زر پر یوں کرے جلوہ نمائی

---

[1] نعوذ باللہ۔ نقل کفر کفر نباشد

جس طرح کہ مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

غور کیجئے۔ یہ باتیں ذوقؔ اس بادشاہ کے متعلق کہہ رہا ہے جس کا مقام نہ دین میں نہ دنیا میں۔ یعنی بہادر شاہ ظفرؔ ہند پر مغلیہ تسلط کا آخری جکڑ بند۔ جس نے ملک پر مٹھی بھر انگریزوں کی حکومت ہوتے دیکھ کر کوئی بہادرانہ قدم نہ اٹھایا۔ ستم بالائے ستم شاعر کی گمراہی ملاحظہ ہو کہ ظفرؔ، ذوقؔ کا شاگرد بھی ہے۔ الٹی گنگا غالباً اسی کا نام ہے۔ ادب کا ایک مسلمان قاری کم از کم محمد ابراہیم نامی کسی شاعر سے ایسے ابیات اور کافرانہ خیالات کی توقع نہیں رکھ سکتا۔ لیکن یہیں ہیں ان مجرّد اور خالص ادب کے پجاریوں کی خدمت میں درخواست کروں گا۔ کہ وہ دواوینِ ریختی، قصائد، عشقیہ مثنویوں کے طویل دفتروں پر نگاہ کریں۔ یہاں ان کو مقصد نظر آئے گا ایک مجرد اور خالص مقصد۔ دولت کا مقصد۔ شہرت کا مقصد۔ عہدہ کا مقصد ——— لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر کون دیکھتا ہے ——— !!!

مندرجہ بالا اشعار پر غور کریں۔ مقصد پرستی نے پہلے شعر میں غلو کا بھدا نمونہ پیش کیا ہے۔ دوسرے شعر میں مقصد پرستی نے حضور سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ذالاصفات کو تشبیہی دنیا میں کھینچ لیا ہے۔ خدا اور اس کا نبی ہی وہ ہستیاں ہیں جنہیں آج تک بے مثال قرار دے کر تشبیہ و استعارہ کے علوم میں پیش کرنے سے دنیا کے سب شعرا نے احتراز کیا۔ مگر یہ مقصد پرستی کی ہی لعنت ہے جس نے اس شاعر کو اردو شاعری میں ایک نیا مگر بے حد ذلیل تجربہ کرنے پر اکسایا۔ اور اس نے ایک معمولی بادشاہ کی پیشانی کی لکیر کو حضور صلعم کی تاریخی انگشت مقدس سے تشبیہ دی یعنی حضور کی ذات کو ایک بادشاہ کے مقابلہ میں مشبہ بہ پیش کیا ———

تیسرے شعر میں دیکھئے مقصد پرستی اور کیا گل کھلاتی ہے۔ اسی بادشاہ کو جس کی نہ دنیاوی حیثیت مسلّم نہ دینی۔ اور جس کی نجاست اظہر من شمس ہے۔ قرآن حکیم کے مقابلہ میں مشبہ کی صورت میں پیش کر کے بے دینی اور کفر و الحاد کے سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔

ادب میں مقصد پرستی جرم ہے۔ بے حد سنگین جرم ہے لیکن مقصد کی چند مثالیں جو اوپر دی گئی ہیں۔ اسی قبیل کے دوسرے تمام مقاصد کی پرستش جرم ہے۔ گر وہ مقاصد جو انسانیت کی فلاح سے متعلق ہیں۔ انسانی ہمادری میں بلند اخلاق پیدا کرنے کا مقصد خدا اور رسول کے احکامات کی تبلیغ کا مقصد، لوگوں میں عزت نفس کا احساس دلانے کا مقصد انہیں پستیوں سے نکال کر رفعتوں پر لے چلنے کا مقصد۔ کیا ان مقاصد کی پرستش بھی ادب میں ناجائز ہے؟ ہرگز نہیں۔

یاد رہے اعلیٰ و ارفع مقاصد ادب کو اعلیٰ و ارفع بنا دیتے ہیں

وہ اعلیٰ و ارفع مقاصد کیا ہیں؟ یہ وہ مقاصد ہیں۔ جن کی پرستش عرب میں حسان بن ثابت [1] ایران میں رومی اور ہمارے ملک میں محسن کاکوروی وغیرہ نے کی۔ انہوں نے لوگوں کے سامنے اسلام کا نظریۂ حیات اور اخلاقیات و بود و باش کے اعلیٰ معیار کی تبلیغ کی۔ لوگوں کو فلاح کی جانب بلایا۔ ان کا دینی اور دنیاوی معیار اونچا کیا۔ کلمۃ الحق اور نشر اسوۂ حسنہ کے مقاصد کی تکمیل کی۔ یہی وہ مقاصد ہیں۔ جن کی پرستش و محبت اور تبلیغ و اشاعت کا بیڑا ذوی الاحترام حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ

---

[1] شاعر رسولؐ

المسیح الثانی نے اٹھایا۔ اسی اصولی محبت نے انہیں انسانیت کے بلند سے بلند درجے تک پہنچایا ہے۔ یہ ارتقا خود ان کے کلام کے ترتیبی مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کلام محمود کے حصہ اول میں بحیثیت ایک مسلمان کے اعلیٰ اور ارفع درجوں کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس جدوجہد کا انحصار چونکہ خالص زہد و تقویٰ، بے غرض خدمت اور بے ہوس عبادت پر تھا۔ اس لئے انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک دوسرے بوجھ کے زیر بار کیا جاتا ہے۔ خلافت اور امامت کا بوجھ!!!

انسان جتنے بلند مقامات سے ارتقا کرتا ہوا گزرتا ہے۔ ہر مقام پر اس کی ذمہ داریاں مختلف ہوتی ہیں۔ جس مقام پر جو معیار انسان کا ہوتا ہے۔ اسی قدر اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کے انعام میں وہ مفید رتبوں اور مفید عزتوں سے سرفراز ہوتا ہے

یہی وہ ارتقا کا اصول ہے جس کی روشنی میں آج ہم عالم انسانی کو دیکھ سکتے ہیں اور اسی اصول پر انسانیت کے مستقبل کا اندازہ کیا جاتا ہے ؞

اخلاقی و اصلاحی شاعری کے بنیادی مسائل

ہمارے معاشرے میں مصلح و ناصح کے کردار کو ہمیشہ نفرت سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے رشحات قلم کو دفتر بے معنی قرار دے کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ دراصل ایک تحریک ہی کا ردعمل تھا۔ تحریک۔ جو ادب برائے ادب یا ادب برائے ذہنی عیاشی کے نقیبوں نے چلائی تھی۔ اس تحریک سے لوگوں کا متاثر ہونا غیر قدرتی یا حیران کن نہیں ہے۔ بری و بھلی تحریکیں چلتی ہیں اور لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ مذکورہ تحریک سے بھی لوگ متاثر ہوئے۔ اس اثر کا بھی ایک پس منظر تھا۔ لوگوں کی ذہنی کم علمی اور بے عملی۔ لوگوں کے اذہان شر کے بیج قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہو چکے تھے۔ لیکن جس نفرت کا لوگوں نے اظہار کیا۔ اس کی بڑی حد تک ذمہ داری ان مصلحین و ناصحین پر ہے۔ جن کے کرداروں نے ان الفاظ کی معنویت کا ساتھ نہ دیا۔ اور لوگوں کے لئے بیزاری کا سبب بن گئے۔ انہیں ناصحین مصلحین نے پیغامبر اخلاق کے آئیڈیل (IDEAL) کو اس قدر بدنام کر دیا تھا کہ وہ ہستیاں جو اس آئیڈیل پر پورا بھی اترتی تھیں عوام میں مقبول نہ ہو سکیں۔ ان نام نہاد ناصحین کی تبلیغ و ہدایات کے طریقہ نے ہی عوام کو بدظن کیا۔ ان میں "خوئے دلنوازی" نہیں تھی۔ جس کا تصور علامہ اقبال کے کلام میں ملتا ہے۔ احمدی رہنماؤں نے ان

لوگوں کو جن کے اعتقادات صدیوں سے زنگ آلودہ تھے متاثر کیا محض اپنی "خوئے دلنوازی" سے، اپنے مشن کی سچائی سے اپنی روحانی عظمت سے، اپنی شبانہ روز کی ریاضت سے، اور اپنی بے غرض عبادت سے ان کے ارشادات میں کھلی کھلی سچائی تھی، نظریاتی صفائی تھی اور اعتقادی عظمت تھی۔ ان کے کلام میں ترنم تھا۔ نرمی و شیرینی سے پر تھا۔ انہوں نے آستینیں چڑھا کر مخالفین کو گالیاں دینے کی بجائے کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال کی۔ انہوں نے محتاط الفاظ میں شر کی مخالفت کی اور بچے تلے الفاظ میں خیر کی موافقت کی۔ یہی ہے خوئے دلنوازی کی تفصیل جو حضرت امیر المومنین مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی کو ورثہ میں ملی ہے۔ اور جس عمدہ عمدہ نمونے ان کی زیرِ تبصرہ کتاب کلامِ محمود میں ملتے ہیں :-

سیدنا محمود کا مشاہدہ و مطالعہ

جس طرح ایک حکیم کی کامیابی مرض کی صحیح تشخیص کے بغیر ممکن نہیں مصلح کے لئے بھی ضروری ہوا کرتا ہے کہ اس کی فکر دقیق اور نظر عمیق ہو۔ وہ معاشرے کے مختلف اعضا پر کڑی نگاہ رکھے۔ اسے معاشرتی بیماریوں کے اسباب سے کما حقہ آگاہی ہو۔ اسے ان امراض کے پس منظر کا پتہ ہو۔ اور وہ معاشرتی امراض کی تاریخ سے واقف ہو اسے پتہ ہو کہ کس دور میں یہ امراض پھیلے۔ ان کا علاج کیسے ہوا۔ آج کیا امراض ہیں آج حالات کیا ہیں۔ ان حالات میں نسخہ ہائے پارینہ ہی کافی ہیں یا نئے تجربات کی ضرورت ہے۔

سیدنا حضرت محمود کی شاعری میں ہماری معاشرتی زندگی کے بڑے پہلوؤں کی سچی سچی تصویریں موجود ہیں۔ وہ ان تصویروں کو بڑے بڑے فنکارانہ انداز میں منعکس کرتے ہیں۔ اور جوش ایمان و صداقت سے معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر زنی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کروہ تصویروں کا پس منظر بیان کرتے ہیں۔ اور ان کو صحت اور صفائی بخشنے کے لئے مناسب ترجمات و ہدایات کا تشیس و فنکر کھل جاتا ہے۔ "مسلمانوں کی خستہ حالت" کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ تو دونوں طرزوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ تصویر بھی واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تنقید کا ایک نہایت ہی مصلحانہ اور مشفقانہ رنگ چلتا ہے ؎

کہنے کو سب طیار ہیں، چالاک ہیں ہوشیار ہیں
منہ سے تو سنو اقرار ہیں اور کام سے بیزار ہیں
ظاہر میں سب ابرار ہیں، باطن میں سب اشرار ہیں
مصلح ہیں پر بدکار ہیں، ہیں ڈاکٹر پر زار ہیں

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بے علمی اور کم عملی سے جو تصنع اور پوچ پن آ گیا ہے۔ اس سے اچھا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ قرونِ اولیٰ کے سچے مسلمانوں کا ایمان اور خود اسلام کی تلقین کہ مسلمان کا ظاہر اور باطن دو نہیں ہو سکتے اس کسوٹی پر اسلامیانِ عالم کو پرکھا گیا ہے۔ اور سیدنا حضور اقدس کی نظر میں اکثریت میں کھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔

اسی بے عملی اور جہالت نے اسلامیان عالم سے دولت دین و دنیا بھی چھین لی ہے۔ اور وہ روز بروز گھاٹے کی طرف جا رہے ہیں۔ ان حالات کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو

سے
چھنے گئے ہیں ملک سب، باقی ہیں اب شام و عرب
پیچھے پڑا ہے ان کے اب دشمن رگائے تا نقب
ہم ہو رہے ہیں جاں بلب، بنتا نہیں کوئی سبب
ہیں منتظر اس کے کہ اب آئے کہیں امدادِ رب

پیالہ بھرا ہے لب بلب
ٹھوکر ہی اک درکار ہے

ہمیں کائنات کے ظاہری عوارض سے روشناس ہونے کے لئے بصارت کی ضرورت ہے۔ کامیابی کی منازل بھی بغیر بصارت کے نظر نہیں آسکتیں۔ انسان کی رذالت اور کور ذوقی کا منطقی تجزیہ کرتے ہوئے حضور فرماتے ہیں ع

آنکھوں ہی میں رہی نہ جب بصارت ❊ دیدارِ رخِ نگار کیوں ہو

گلشنِ اسلام کی زبون حالی کا راز یہی ہے کہ مسلمانوں میں بصارت نہیں رہی۔ بصارت جس سے انسان حرام و حلال، راہبر و راہزن، خیر و شر اور اسلام و کفر میں امتیاز کرتا ہے جس سے وہ شاہراہِ حیات صالح متعین کرتا ہے جو اسے منزل پر پہنچاتی ہے۔ پھر وہ ایک سچے فنکار کی طرح غمِ دوراں کو اپنے سینے پہ لیتے ہیں۔ عالمِ اسلام کے تمام خارجی تاثرات کو جذب کرتے ہیں، یہاں وہ غمناک نظر آتے ہیں۔ گلوگیر اور نم چشم اس قسم کے جذبات کا اظہار نظم "دردِ دل" میں کیا گیا ہے سے

کوئی گیسو میرے دل سا پریشاں ہو نہیں سکتا
کوئی آئینہ مجھ سے بڑھ کر حیراں ہو نہیں سکتا
کوئی مجھ سا لگتا ہوں کہ پریشاں ہو نہیں سکتا

کوئی یوں غفلتوں پر مجھ سا گریاں ہو نہیں سکتا

ایک اور جگہ نہایت خوش اسلوبی سے کہتے ہیں ؎

میں رو رہا ہوں قوم کے مرجھائے پھول پر
بلبل تو کیا ہے اس سے کہیں خوش نوا ہوں میں

"قوم کے مرجھائے پھول" میں انہوں نے اس قوم کی حقیقی عظمت اور درجات کا تذکرہ کیا ہے۔ اور قوم کو ایک باغ سے تشبیہ دی ہے جس کے پھول اپنے کردار اور بد اعمالیوں کی وجہ سے مرجھا چکے ہیں۔ آپ گلشن اسلام کو مسلسل پانی دیتے جاتے ہیں اور کوشاں ہیں۔ کہ یہ گلشن اپنی اصلی حالت پر آجائے اور اس کے پھولوں میں شگفتگی پیدا ہو جائے۔ افسردگی اور حالات کی بھیانک یورشوں کے باوجود قوم سے خطاب فرماتے ہیں ؎

مسلم سوختہ دل یونہی پریشان نہ ہو
تجھ پہ اللہ کا سایہ ہے ہراساں نہ ہو

افسردگی اور روشن مستقبل کا حسین امتزاج اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے اسی امتزاج کو ایک جگہ ملاحظہ کیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

کیوں اس کی آب و تاب وہ مٹی میں مل گئی
جیسے ہو خاک میں کوئی موتی ملا ہوا

یہاں قوم کو ایک موتی کہا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ موتی اپنے اندر آب و تاب رکھتا ہے۔ جیسا کہ ماضی کے واقعات شاہد ہیں۔ لیکن اب یہ موتی خاک میں ملا ہوا ہے اور اپنی چمک اور وقار عارضی طور پر ضائع کر چکا ہے۔ آپ اس موتی کو ایک

روشن مستقبل کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی آب و تاب کبھی ضائع نہیں ہوگی۔ وہ پھر دنیا میں ظاہر ہوگی اور کائنات کو جگمگائے گی ؎

کفر نے لاکھ تدبیریں کیں لیکن پھر بھی
صفحہ دہر سے اسلام مٹایا نہ گیا

قوم کی اس افسردگی اور مایوسی کو دور کرنے کے لئے ایک خوشخبری دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

رب افواج خود آتا ہے تیری نصرت کو
باندھ لے اپنی کمر بندۂ حرمان نہ ہو

میں اسی باب کے شروع میں بتا چکا ہوں کہ موجودہ دور کے روحانی حکیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرض کی تشخیص کرے اور دیکھے کہ اس مرض کی کیا وجوہات ہیں۔ حضور اقدس نے اس مرض کا تجزیہ کیا اور اسباب مرض بتاتے ہوئے فرماتے ہیں

بحرگناہ میں پھر کبھی کشتی نہ ڈوبتی
ہم ناخدا۔ خدا کو بنانے تو خوب تھا

چونکہ ہم نے اپنی کشتئ حیات کو دنیاوی سہاروں پر چھوڑ دیا ہے۔ اسی لئے یہ کشتی بھنور میں پھنسی ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کے سہارے پر اپنی کشتی کو چھوڑتے اور اس کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے۔ تو یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔ خدا کو ناخدا بنانے کی تلقین کرتے ہوئے خدا کا قرب حاصل کرنے کے ذرائع بتاتے ہیں ؎

قرب اس کا نہیں پاتا نہیں پاتا محمود
نفس کو خاک میں جب تک نہ ملائے کوئی

خدا کے عفو کا آغاز یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں ایک انسان اپنے ماضی و حال کا جائزہ لے کر لغزشوں کی ندامت کرتا ہے۔ توبہ کا فلسفہ یہی ہے۔ توبہ ایک خطِ متارکہ ہوتا ہے۔ غیر صالح اور صالح مرحلۂ حیات میں توبہ کا خطِ تنسیخ کھنچ جانے کے بعد انسان کے اقوال و افعال میں کوثر و تسنیم کی سی پاکیزگی آجاتی ہے۔ اس کا عمل و حرکت اسلام کی حدود میں محدود ہو جاتا ہے۔ توبہ ایک بھٹی ہے۔ جہاں کھوٹ الگ ہو جاتا ہے اور سونا اپنی سنہری زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ انسان بنیادی طور پر سونا ہی ہے۔ ماحول کی ناسازگی کی یورشیں اور حالات کی غلاظت کی آلائشیں اسے کھوٹا کر دیتی ہیں۔ تیسرے شعر میں آپ نے "آئیڈیل" انسان یا مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے۔ ایک ایسا تصور جب بھی ابنائے آدم پر چھا گیا روئے ارض پر امن و سلامتی، پاکیزگی، طہارت کا دور دورہ ہو جائے گا ؎

زرِ خالص سے بڑھ کر صاف ہونا چاہیئے دل کو
ذرا بھی کھوٹ ہو جس میں مسلماں ہو نہیں سکتا

مسلمان کا یہ تصور جو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے کو کسوٹی بنا کر ہم اگر اپنے آپ کو پرکھیں تو شرم سے گردن جھکا لیں۔ کھوٹ "بے دین اور رجعت پسند فلاسفروں نے کھوٹ کو بھی انسانی عناصر میں شامل کر دیا ہے۔ جو ان کی اپنی پستی پر دلالت کرتا ہے۔ کیا ہم نے بغیر کھوٹ کے مسلمانوں کے بارے میں پڑھا نہیں؟ اور کیا ڈھونڈے سے آج بھی نہیں مل جاتے؟؟ ضرور مل جاتے ہیں۔ اسی لئے حضور فرماتے ہیں ؎

ہمیں بھی ہے نسبتِ تلمذ کسی مسیحا نفس سے حاصل
ہوا ہے بے جان گو کہ مسلم مگر اب اس کو جلائیں گے ہم

عیسیٰؑ ایک مکمل انسان تھے۔ وہ اسلام کے آئیڈیل پر پورے اترتے تھے۔ دم عیسیٰ
سے بعید نہیں کہ اس نے مردوں کو زندہ کر دیا ہو۔ کیوں کہ شمع فروزاں سے چراغ خفتہ
روشن ہوتا ہے۔ سیدنا محمود نے جس مسیحا نفس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ بھی
اپنے وقت کے عیسیٰ ہیں۔ کیونکہ ان کے دم سے بھی ایک قبرستان زندگی حاصل کر چکا
ہے۔ وہ شمع نور وہدایت آج بھی روشن ہے۔ صلائے عام پروانوں کے لئے ہے۔

حضرت امیر المومنین سیدنا محمود تلقین وہدایت کے باب میں عموماً زیر لب
رہتے ہیں۔ مگر کبھی کبھار غصہ میں بھی آجاتے ہیں۔ مگر غصہ میں شفقت کا عنصر اتنی زیادتی
کی وجہ سے غصہ پر غالب آجاتا ہے۔ اب یہ غصہ غصہ نہیں رہتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
مسلم قوم مجموعی لحاظ سے سوئی پڑی ہے۔ "ذکر و فکر و عمل" جو مسلمان کے عناصر ثلاثہ ہیں کا وقت
ہو رہا ہے۔ تو آپ قوم کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ؎

دم عیسیٰ سے مردے جی اٹھے ہیں — جو اندھے تھے انہیں اب سوجھتا ہے
ذرا آنکھیں تو کھولو اے سونے والو — تمہارے سر پہ سورج آگیا ہے

دم عیسیٰ کی دو عملی زندگی اور بصارت کی خالق ہے۔ سونے والے جو "مردہ" بھی
ہیں۔ اور "اندھے" بھی۔ ان کے لئے شعر اول میں کتنی بڑی منطقی دلچسپی ہے۔ ایک عام
لیڈر اور ایک روحانی رہنما میں یہی فرق ہے۔ لیڈر اپنی دکان چمکانے کے لئے
لوگوں کو جگاتا ہے۔ اور جگا کر کچھ نہیں دیتا بلکہ مانگتا ہے۔ مگر ایک روحانی رہنما سوئے
ہوؤں کو جگا کر انہیں دین و دنیا کی دولتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ زندگی اور بصارت
دے کر! کیونکہ یہی دو چیزیں منبع ہیں۔ دوسری نعمتوں اور برکتوں کا جس کی طرف سیدنا
حضرت امیر المومنین نے اشارہ فرمایا ہے

پیرایۂ تبلیغ و ہدایت

خدا اور جماعت کی طرف سے جو اہم ذمہ داری سیدنا محمود پر عاید ہوئی وہ تبلیغ و ہدایت ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ نے خلافت سے پہلے اور بعد اپنی حیثیت کے مطابق بہت کچھ کیا ہے۔ تبلیغ کا کام انہوں نے کئی ذرائع سے کیا ہے۔ جن میں ان کے کلام کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔

"مقصد پرستی" کی بحث میں میں یہ لکھ چکا ہوں کہ کلام میں مقصدیت کو بدنام کرنے والے وہی شعرا تھے جو ادب میں نعرے لگاتے تھے۔ تحریکیں پیش کرتے تھے۔ نوحے لکھتے تھے۔ قصیدے کہتے تھے۔ مگر خود بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ وہ قافلوں کی رہبری کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر ساتھ نہیں چلتے تھے۔ وہ ایک نعرہ لگاتے لوگ لبیک کہتے وہ ایک تحریک پیش کرتے لوگ تیار ہو جاتے۔ وہ ایک حکم دیتے تو لوگ چل پڑتے تھے۔ ادھر نہ تو منزل مقصود کا واضح تصور اہل کارواں کو دیا جاتا۔ اور ادھر تھوڑی دور چلنے کے بعد جب لوگ دیکھتے حرکت کا حکم دینے والا رہنما غائب ہے۔ تو وہ رہبری کے نام ہی سے بیزار ہو جاتے۔ وہ بھٹک جاتے اور جدھر جس کا منہ اٹھتا چل دیتا۔ ایک

عالم افراتفری اور انتشار پھیل جاتا اور لوگوں کے ذہن مسموم ہونے کے بعد زنگ آلود ہو جاتے تھے۔

وہ قوم جسے ہمیشہ سراب پر پانی کا دھوکہ ہوا جس کے ذہن و دل کی قوتوں کو ہمیشہ لوٹا گیا۔ قرن زوال میں کسی ہدایت کو کیوں کر قبول کر سکتی تھی۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح الموعودؑ میرزا غلام احمد صاحب کی آواز نے ایک بڑے گروہ کو متاثر کیا۔ تو ہمیں اس آواز کی صداقت۔ اس کی کشش اور مقبولیت کا یقین ہو جاتا ہے۔ حضرت مسیح الموعودؑ کے پسر موعود بشیر الدولہ سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد نے کلام محمود میں بھی تبلیغ و ہدایت کا جو سلسلہ جاری رکھا ہے وہ اس کلام کی تاریخ سے عین مختلف ہے۔ اس میں بات کو سمجھانے اور اس پر عمل کرانے کا ایک انوکھا انداز ہے۔ اس کی نظریاتی صفائی قوائے سامعہ یا مشاہدہ میں سے گذرتی ہوئی فوراً دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اور ایک مستقل مقام حاصل کر لیتی ہے۔

"نونہالانِ جماعت سے خطاب" نظم دیکھئے۔ یہ خطاب کسی ہنگامی سٹیج سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت بالمشافہ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں اسلوب بیان کو بھی زیادہ دخل ہے ؂

سر میں نخوت نہ ہو آنکھوں میں نہ ہو برقِ غضب
دل میں کینہ نہ ہو لب پہ کبھی دشنام نہ ہو
عقل کو دین پہ حاکم نہ بناؤ ہرگز
یہ تو خود اندھی ہے گر نیّرِ الہام نہ ہو

امن کے ساتھ رہو فتنوں میں حصہ مت لو
باعثِ فکر و پریشانیِ حکام نہ ہو

یہ اشعار مختلف قسم کے نصائح کو محیط کرتے ہیں۔ تینوں میں قدرِ مشترک ایک ہے۔ اور وہ ہے ایک مکمل انسان کی تعمیر کے لیے جو خمیر اٹھایا جانا چاہیئے۔ اس کے چند اجزا پہلے شعر میں ایک مکمل مسلمان کی تصویر پیش کی گئی ہے اور شعر میں بیان کردہ ممنوعات کا سائنسی تجزیہ کر دیکھیں کتنا حیات پرور اور انسانیت افروز ہے۔ نخوت سے انسانی برادری اور اسلامی اخوت کی بنیادوں کو ضعف پہنچتا ہے۔ قوت غضب کی افراط بھی معاشرے میں ہلچل پیدا کرتی ہے۔ انسان کے دینی اور دنیاوی ارتقا میں حائل ہوتی ہے۔ اس کی پاکیزہ فطرت کو دباتی ہے۔ اور اس کی بصارت و بصیرت دونوں کو دھندلا دیتی ہے۔ اسلام کینہ پروری کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اکثر حالتوں میں یہ ذاتی رنجشوں اور کبیدگیوں کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ جو معاشرے کی امن و سلامتی کو تہ و بالا کر سکتی ہے۔ کینہ اور دشمنی میں یہی فرق ہے۔ کیونکہ کینہ پرور ہمیشہ بد باطن ہوتا ہے اور دھوکا دہی کا مرتکب ہوتا ہے۔ مگر دشمنی علی الاعلان ہوتی ہے۔ اور اس کا مظاہرہ بھی سر میدان کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مظاہرہ ذاتی تسکین کی بجائے کسی اسلامی مقصد کے حصول کے لئے ہے تو عین جائز ہے۔ اسی ضمن میں گالی بھی آجاتی ہے۔ بلند مقاصد کی خاطر تو دشنام طرازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ اس چیز کا تعلق بھی ذاتیات سے ہے۔ لہذا یہ بھی ناجائز قرار دی گئی ہے۔

دوسرے شعر میں عقل کی حقیقی اہمیت اور اس کے عمل کی وضاحت کی گئی ہے آپ عقل کو اندھی قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ آج تک وہ سب لوگ جو راہِ خدا سے بھٹک

گئے۔ اس عقل ہی پر بھروسہ کرتے تھے۔ حالانکہ روحانی نور و ہدیٰ سے وہ محروم تھے۔ اور اس کی مبیّنہ بدعنوانیوں کی وجہ سے خدا کی جانب سے وحی اور الہام کے دروازے ان پر بند تھے۔

تیسرے شعر کی نوعیت سیاسی ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معاشرتی مسئلہ بھی ہے۔ اس میں ان فیشن پرست انقلابیوں کی مذمت کی گئی ہے۔ جو ذاتی اقتدار کے حصول کی خاطر حکومت کے کاموں پر جائز ناجائز تنقید کرتے رہتے ہیں۔ اور فتنے کھڑے کر کے لوگوں کو بھی مشتعل کرتے ہیں۔ اور لوگ جو نہی امن عامہ کو تباہ کر کے اپنا اطمینان قلب بھی لٹا دیتے ہیں اور خطرناک نتائج کا سامنا کرتے ہیں۔

کلامِ محمود کے پند و نصائح یوں بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں کہ وہ دقیانوسی اور فرسودہ افکار حیات کی حمایت نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں موجودہ انسان کے اپنے وقتی مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں وہ راہیں ہوتی ہیں جن پر بیسوی صدی کے انسان کو چلنا ہے۔ یہ نصائح حکم نہیں ہوتے بلکہ ایک مشورہ کے رنگ میں ہوتے ہیں۔ حکم سے مشورہ زیادہ دلنشین اور زیادہ قابل قبول ہوتا ہے۔ مشورہ میں مشیر کی پوری ہمدردی اور پوری توجہ شامل ہوتی ہے۔ ان نصائح کا ایک عقلی اور سائنسی جواز ہوتا ہے۔ بُرے افعال کی روک تھام کے لئے دوزخ کے عذاب سے نہیں ڈرایا جاتا۔ اور اچھے اعمال کے لئے جنت کے وصال سے نہیں بہلایا جاتا۔ بلکہ ہر نیکی اور بدی کا ایک واضح قسم کا مادی ردّعمل پیش کر دیا جاتا ہے۔ وہ چونکہ عام فہم کعقل پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک خشک واعظ اور ایک خوش بیان شاعر کے درمیان حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے۔

حضرتِ محمودؔ کی ایک دوسری نظم "دردکا درمان" کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ساغرِ حُسن تو پُر ہے کوئی میخوار بھی ہو
ہے وہ بے پردہ کوئی طالب دیدار بھی ہو
عشق کی راہ میں دیکھے گا وہی روئے فلاح
جو کہ دیوانہ بھی ہو عاقل و ہوشیار بھی ہو

ان اشعار میں بھی معاشرتی بے عملی اور مذہبی لاپروائی پر ایک مشفقانہ طنز ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک زرین فلسفہ بھی ہے۔ دوسرے شعر میں اردو شاعری کی فرسودہ روایت سے کھلی بغاوت ملتی ہے جس میں ہمیشہ دیوانگی ہی کی ضرورت جتلائی گئی۔ فرض کیجئے کہ دیوانگی سے مراد جنون "عشق الٰہی" ہے تب بھی تعقل و تمیز کی ضرورت باقی ہے۔ ایک مسلمان کو عاقبت کے لئے اگر جنون "عشق الٰہی" درکار ہے۔ تو عالمِ آب و گل میں شرعی زندگی بسر کرنے کے لئے قوائے تمیز و تعقل کی بھی ضرورت ہے۔ اس شعر میں "فلاح" کے حصول کے لئے جس طرح دیوانگی کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح تعقل اور ہوشیاری کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔

"خدمت" انسانی برادری کی شیرازہ بندی کی بنیادوں میں سے ہے۔ باپ کی خدمت ماں کی خدمت، بزرگوں کی خدمت، استاد کی خدمت اور پھر بہت بڑی خدمت قوم و وطن کی خدمت ——— خدمت ارتقاء عالم کی اہم کڑیوں میں سے ہے۔ خدمت کا مفہوم انسانیت کے ساتھ وسعت میں بڑھتا اور گھٹتا رہا ہے۔ آج ہم سیدنا حضرت محمود خدمت کی ایک جامع تعریف مرتب کرتے ہیں۔ ایک کائناتی و آفاقی تعریف

ایک مثالی اور معیاری تعریف ــــــ خدمت ــــــ !!

"عشق کا لطف حقیقی" اس نظم کے تین اشعار درج کرتا ہوں ؎

یا فاتح روح ناز ہو جا
یا تو ہمہ تن نیاز ہو جا

خدمت میں ہی عشق کا مزہ ہے
محمود نہ بن ایاز ہو جا

جا دھونی رما دے اس کے در پر
انجام سے بے نیاز ہو جا

ان کی ایک دوسری غزل سے ایک شعر دیکھئے ؎

کامیابی کی تمنا ہے تو کر کوہ کنی
یہ پری شیشے میں اترتی ہے کہیں باتوں سے

فلسفۂ جہد مسلسل اور سخت کوشی جو انسانیت کی روح ہے۔ اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک تلمیح کا سہارا لے کر مقاصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کی ایک تاریخ قلمبند کر دی ہے۔ یہاں پھر بے عملی کی مذمت ہے۔ اعلےٰ مقاصد کے حصول کے لئے مناسب محنت کی حمایت ہے۔ جد و جہد کی تلقین و ہدایت کا اس سے مختصر اور دلچسپ پیرایہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

سیدنا محمود جانتے ہیں کہ جد و جہد کے میدان میں تکلیفیں اور مصیبتیں ضرور آئیں گی۔ دنیاوی لذات اور رنگینیاں انسان کا راستہ روک لیں گی۔ اور اسے بہکانے کی کوشش کریں گی۔ اگر انسان ان کی طرف توجہ نہ بھی دے۔ تو بھی اس راہ میں اور سخت

مقامات کا آنا بھی ضروری ہے۔ جو انسان کو اس راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے۔

داغ مرحوم کہتے ہیں ؎

راہ روِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں

لیکن داغ مرحوم نے ان مقامات کی تشریح نہیں کی۔ صرف "سخت مقامات" کہہ کر اپنے فرائض کو ادا کرنا چاہا۔ اور نہ ہی ان سخت مقامات سے بچنے کی تدبیر بتائی اور یہی وجہ ہے کہ شعر تعمیری حدود میں داخل ہونے کا شرف حاصل نہ کر سکا۔ اور ادب برائے ذہنی عیاشی تک محدود رہا۔ حضرت محمود اپنے فرائض کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے ان خامیوں کو پورا کرتے ہیں فرماتے ہیں ؎

منزل عشق ہے کٹھن راہ میں راہزن بھی ہیں

پیچھے نہ مڑ کے دیکھ آگے قدم بڑھائے جا

منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے مسافر سے ایک جامع اور موثر انداز میں ان مشکلات کا ایک اور حل بتاتے ہیں اور یہی زندگی کی حقیقی اقدار کا تقاضا ہے ؎

ذکرِ خدا پہ زور دے ظلمتِ دل مٹائے جا

گوہرِ شب چراغ بن دنیا میں جگمگائے جا

ذکرِ خدا کے باوجود ممکن ہے انسان میں کچھ خامیاں ایسی ہوں جنہیں اس کی ظاہری نگاہیں اور عقل نہ ڈھونڈ سکے۔ ان خامیوں کے دور کرنے کا طریقہ بتانے میں کس اعلیٰ انداز سے کام لیتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ انسان مسلسل ذکر الٰہی کرتا رہے جس کے نتیجے میں یہ خامیاں خود بخود دور ہو جائیں گی فرماتے ہیں ؎

مانیں نہ مانیں اس سے کیا بات تو ہوگی دو گھڑی
قصہ دل طویل کر بات کو تو بڑھاتے جا

آخر میں سیدنا محمود کے پیرایہ تبلیغ و ہدایت کا ایک اور بہترین نمونہ نقل کرتا ہوں۔ اس میں بھی انداز بیان میں ایک دلنشین قوت ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ ان کے تکلم زیرلب نے ہی یہ قوت پیدا کر دی ہے۔ اس میں بھی دینی اور دنیاوی خصائص کی تبلیغ جاری رکھی۔ اسلوب کی دلچسپی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے

عہد شکنی نہ کرو اہل وفا ہو جاؤ
اہل شیطاں نہ بنو اہل خدا ہو جاؤ

حق کے پیاسو کیلئے آب بقا ہو جاؤ
خشک کھیتوں کیلئے کالی گھٹا ہو جاؤ

دم عیسیٰ سے بھی بڑھ کر ہو دعاؤں میں اثر
ید بیضا ہو موسیٰ کا عصا ہو جاؤ

بحر عرفاں میں غوطے لگاؤ ہر دم
بانیٔ کعبہ کی تم کاش دعا ہو جاؤ

ایمانِ محکم، یقینِ مکمل، عملِ پیہم

ایمان، یقین اور عمل —— یعنی نظریاتی صفائی، رجائیت اور جدوجہد وہ ضروری عناصر ہیں۔ جو تحریکوں کی روح بنا کرتے ہیں یہ وہ Abstract قندیلیں ہیں۔ جو اندھیروں میں کسی تحریک کی راہنمائی کرتی ہیں۔ اور یہ تجربہ ہے کہ جہاں ان میں سے کسی عناصر کی کمی ہوئی۔ وہیں تحریک یا تو ختم ہو گئی۔ اور یا اس کی رفتار آندھی کی بجائے مردِ ناتواں کی سی ہو گئی۔ سلسلہ احمدیہ کی مسلسل ترقی اور مضبوطی کا راز بھی انہی تین عناصر میں پنہاں ہے۔ امام جماعت احمدیہ سیدنا حضرت محمود کی شاعری میں قدم قدم پر ان قوتوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی نظم "ولولہ تبلیغ" میں جو قوت اور شدت ہمیں ملتی ہیں۔ مذکورہ عناصر کو قبول کرنے کا ردِ عمل ہے۔ اس میں ایک سرمستی کا عالم بھی ہے۔ والہانہ انداز بھی اور آگے بڑھنے کی دھن بھی۔

ساری نظم چونکہ کیف میں ڈوب کر لکھی گئی ہے یہی وجہ ہے۔ کہ قاری بھی ایک وہی کیفیت محسوس کر کے ایک گہرا تاثر قبول کرتا ہے۔ نظم اگرچہ داخلی خیالات

کی مظہر ہے۔ پھر بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک دعوت عمل دیتی ہے۔ اور شاعر جب آگے بڑھتے ہیں۔ تو ساری زندگی ساری کائنات ان کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے سہ

اس زندگی سے موت ہی بہتر ہے اے خدا
جس میں کہ تیرا نام چھپانا پڑے ہمیں
محمود کرکے چھوڑیں گے ہم حق کو آشکار
روئے زمیں کو خواہ ہلانا پڑے ہمیں

مذکورہ بالا عناصر ثلاثہ کی خوبصورت شدت ان کی نظم "جنس وفا کا پیمانہ" میں بھی ملتی ہے۔ اس میں صبر کی تلقین کے ساتھ ساتھ ایک خوشنما مستقبل کی بھی بشارت ملتی ہے۔ سلسلے کی مخالفت کو مسکرا کر نظر انداز کیا جاتا ہے پاؤں کی مضبوطی پر زور دیا جاتا ہے چند اشعار دیکھیئے سہ

دشمن کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دوا تم صبر کرو وقت آنے دو
جب سونا آگ میں پڑتا ہے تو کندن بن کے نکلتا ہے
تم گالیوں سے کیوں ڈرتے ہو دل جلتے ہیں جل جانے دو
یا عشق محمد عربی ہے یا احمد ہندی کی ہے وفا
باقی تو پرانے قصے ہیں زندہ ہیں یہی افسانے دو
وہ تم کو حسین بناتے ہیں اور آپ یزیدی بنتے ہیں
یہ کیا ہی سستا سودا ہے دشمن کو تیر چلانے دو

ان اشعار میں نظریات کے سلسلے میں دوٹوک بات کرنے کا انداز لائق تحسین ہے۔ اور تیسرے شعر میں ذہنی الجھاؤ کو دور کرنے کے لئے جو عام فہم اور ترقی پسندانہ رویہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ بے حد انقلابی ہے۔ آج اسلام روایات اور ضعیف اعتقادات کا مجموعہ بن گیا ہے۔ اور بے شمار لہو و لعب کے ذرائع کو مذہبی ارکان کا نام دے دیا گیا ہے جن سے لوگوں میں ذہنی انتشار پھیلتا ہے۔ بے علمی اور بد عملی کے رجحانات پرورش پاتے ہیں۔ اور لوگ ایک ایسے راستے پر چل نکلتے ہیں۔ جسے اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ہے

"باقی تو پرانے قصے ہیں زندہ ہیں یہی افسانے دو"

اس مصرعہ میں زندگی اور موت کو پیش کیا گیا ہے۔ فرسودہ روایات اور توہمات کو موت۔ محمد عربی اور آپ کے خادم احمد ہندی جو خود مظہر اسلام اور معلم اخلاق ہیں کو زندگی سے تشبیہ دی ہے۔ اب یہ عوام کا کام ہے۔ کہ وہ ایک کو اپنے لئے منتخب کرلیں۔ خدا کی راہ میں مرنا بھی زندگی ہے۔ اس کی مزید وضاحت ان اشعار میں دیکھیئے ؎

دوستو کچھ نہ کہو مجھ سے مجھے جانے دو
خنجر ناز سے تم سر مجھے کٹوانے دو

دوستو جسم کو کھول دو زنجیر دل کو
جاکے جنگل میں مجھے دل ذرا بہلانے دو

نفس پر بوجھ ہی ڈالیں گے تو ہو گی اصلاح
اونٹ لانے ہیں یونہی چیخنے چلانے دو

ان میں جہادِ عمل کا والہانہ جذبہ ملتا ہے۔ ایک ایسا جذبہ جیسے نہ دبایا جا سکتا اور نہ بہلایا جا سکتا ہے۔ جذبہ عشقِ الٰہی کا یہ تصور اُن کی اُس نظم میں ملتا ہے جو تحریک دشمن عناصر کے جور و ظلم سے مجبور ہو کر لکھی گئی ہے ؎

عاشقوں کا شوقِ قربانی تو دیکھ
خون کی اس راہ میں ارزانی تو دیکھ
وعظِ قرآن پر کبھی تو کان دھر
علم کی اس میں فراوانی تو دیکھ
فرش سے جا کر لیا دم عرش پر
مصطفیٰؐ کی سیرِ روحانی تو دیکھ

دینِ اسلام اور خاتم النبیین **محمد عربی**ؐ پر دفتروں کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، مگر سیدنا محمودؓ کی نظم "میرا دل" کا ایک دریا کو کوزہ میں بند کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل دو اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جسے نوازے خدا کی رحمت اسی میں سب خوبیاں ہوں پیدا
غزال لاکھوں ہیں اور بھی تو ہے بات کیا آہوئے ختن میں
مقابلہ دینِ مصطفیٰؐ کا یہ دیگر ادیان کیا کریں گے
ہیں مردہ نبیوں کے مردہ مذہب لپیٹ رکھو انہیں کفن میں

پہلے شعر میں حضور سرورِ کائنات کی امتیازی خصوصیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ جو فرزندانِ توحید کا متفقہ ایمان ہے۔ اور جو مادی تجربہ کے ساتھ بھی ثابت کی جا سکتی ہے۔ دوسرا شعر ایک اہم موضوع سے متعلق ہے۔ جو تمنا مذہبیہ

ہے۔ مگر یہاں پر لکھے الفاظ میں احمدیت کے نکتۂ نظر سے دین مصطفےٰ یعنی اسلام جسے اگر مذہب کے معنوں میں قبول کیا جائے۔ تو شریعت کا اطلاق بھی اس دین پر ہو سکتا ہے۔ حضرت محمود بغیر لگی لپٹی رکھے دو ٹوک اسلوب میں فرماتے ہیں۔ کہ

اسلامی شریعت تمام گذشتہ اور آئندہ شریعتوں کو منسوخ کرتی ہے اور اسلام کے بعد ہر دین کی موت واقع ہوتی ہے۔ کسی ذی ہوش اور سائنسی دماغ کے لئے ان امور کی تصریح درکار نہیں ہے جستجو اور سوچ و بچار کرنے والا ہر انسان اس مسئلہ کو آسانی سے حل کر سکتا ہے۔ اس مقالے کا موضوع اس بحث میں پڑنے کی اجازت بھی نہیں دیتا:

کلامِ محمودؔ کی فنی خوبیاں

سیدنا حضرت محمود کی شاعری کے پیش نظر ایک عظیم مقصد ہے۔ شعر کہتے وقت جو شے ان کے لئے سب سے ضروری ہے وہ نصب العین کی علمبرداری ہے جس کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ انہوں نے شعر میں ڈھونڈھا ایک قاری جب کلام محمود کا مطالعہ کرتا ہے۔ تو اس کے پیش نظر بھی نظر ثانی حُسن ہی ہوتا ہے۔ جو اس میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ قاری کے لئے سب سے بڑی دلکشی اُن اسرار و رموز حیات۔ شمع نور و ہدایت اور محاسن ایمان و اخلاق جو کلام محمود کے مطالب کے اہم اجزا ہیں۔ میں ہوتی ہے۔ سیدنا محمود شاعر ہیں۔ وہ ایک بہت بڑی حقیقت پسند اور حقیقت نواز جماعت کے راہنما ہیں۔ وہ شعر کی ملاحت و شیرینی کی محدود چار دیواری میں نہیں رہ سکتے۔ ایک قاری ان سے فنی موشگافیوں یا صنعتی و عروضی شعبدہ بازیوں کا مطالعہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تاہم ہم جب کلام محمود کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں بعض مقامات پر تشبیہ و استعارات کی ندرت اور زبان و بیان کی لطافت اس ترتیب سے ملتی ہے۔ کہ چونک جاتے ہیں۔ دردمند دل کے قلب پر جو اثرات ہو سکتے ہیں۔ ان کا بیان اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

ایک دل شیشہ کی مانند ہوا جاتا ہے
ٹھیس لگ جائے ذرا سی تو صدا دیتا ہے

چشم نیم وا اور اس کے ردِ عمل کو تقریباً سبھی شاعروں نے باندھا ہے اور کوئی اسلوب نہیں چھوڑا۔ میر نے کہا ہے ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

میر اتنے بڑے اعلیٰ شاعر ہو کر بھی نیم خوابی یا نیم وا چشم سے کلیوں یعنی ایک خارجی شے کو ہی متاثر کرتے رہے۔ مگر سیدنا محمود نے چشم نیم وا کا تاثر قلب انسانی پر قبول کیا اور سرشار ہو گئے ؎

اس کی چشم نیم وا سے میں بھی سرشاروں میں ہوں
درمیاں میں ہوں نہ سوتوں میں نہ بیداروں میں ہوں

میر اور محمود میں موضوع کا جو اختلاف رونما ہوا۔ اس کے محرکات یہ ہیں۔ کہ میر کا رنگ تغزل میں ڈوبا ہوا اور وہ ایک جسمانی محبوب سے ہمکلام تھے۔ سیدنا محمود کا یہ شعر ان کی نظم "مے عرفان" میں سے ہے ان کا محبوب مجسم نہیں وہ حسن ازل ہے اور نور معرفت ہے۔ چشم نیم وا کنایہ ہے قدرت سے جو عیاں ہے بھی اور نہیں بھی۔ نیم خوابی اور نیم بیداری کنایہ ہے اس نامکمل علم سے جو اب تک نوع انسان کو حاصل ہوا ہے۔ اردو اور فارسی کے عظیم مشاہیر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ شاعر اپنے محبوب سے ہمیشہ "اک نظر دیکھ تو لے" کا مطالبہ کرتے رہے۔ بعض شعرا نے تو اس ایک نظر کے بعد اس کی آنکھوں کی تعریف کی اور

اُس کی آنکھوں کو شراب یا میخانہ سے تشبیہ دی۔ باقی شعرا نے محبوب کی نظر کا ردِ عمل تباہی و بربادی پیش کیا۔ مثلاً جناب جگر مراد آبادی جو موجودہ دور کے رئیس المتغزلین ہیں۔ محبوب کی اک نظر کے بعد اس کا ردِ عمل یوں پیش کرتے ہیں ع

"بہت قریب سے بجلی گرا دی جاتی ہے"

کئی اور تغزل کے علمبردار شعرا نے بھی محبوب سے یہی التجا کی ہے۔ کہ مجھے دیکھ کر دیوانہ بنا دے۔ چونکہ ان شعرا کا محبوب ایک انسانی پیکر ہے۔ اس لئے اس عشق میں تباہی و بربادی ضروری ہے۔ جیسا کہ اس لفظ کے لغوی معنے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے۔ عشق نام ہے اُس حس کا جو دو انسانی پیکروں کے مابین ہوتا ہے اور اس میں تباہی کا ہونا ضروری ہے۔ مگر حقیقی محبت میں تباہی مطلق نہیں ہوتی اور نہ ہی دیوانگی ہوتی ہے۔ ہاں اُس حقیقی نگاہ کا ردِ عمل مستی و سرمستی ـــــ ایک لا محدود مستی ہوتی ہے۔ سیدنا محمود اس مفہوم کو بیان فرماتے ہیں ؎

تجھ کو تیری مخمور نگاہوں کی قسم ہے
اک بار ادھر دیکھ کے مستانہ بنا دے

یہاں لفظ "مستانہ" استعمال کیا ہے نہ کہ "دیوانہ"۔ اور یہی اس شعر کی خوبی ہے۔ جو اُسے بلند کرتی ہے۔

خزاں نصیب بہار کے گذر جانے کا بیان دیکھئے۔ فرماتے ہیں ؎

سونگھی نہ بوئے خوش نہ ہوئی دیدِ گل نصیب
افسوس دن بہار کے یونہی گذر گئے

دلآویز اور ایمان افروز تشبیہات و استعارات ان کی نظم "خدا کی راہ میں

مرنا اور جینا" میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ دو شعر ؎

نہیں ممکن کہ میں زندہ رہوں تم سے جدا ہو کر
رہوں گا تیرے قدموں میں ہمیشہ خاک پا ہو کر

ہمیشہ نفس امّارہ کی باگیں تھام کر رکھیو!
گرا دے گا یہ سرکش ورنہ تم کو سنج پا ہو کر

خلوص اور جذبے کا اثر ہمیشہ شعر کی ہیئت پر پڑتا ہے۔ اور کلام سہل ممتنع کی سرحدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت شعر ایک الہامی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت میں جولانی ہوتی ہے۔ اور ذہن و دل کی پاکیزہ یکسوئی سے شاعر خود کلامی میں نہایت موثر اشعار کہہ جاتا ہے۔ تین اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

(۱) محمد پر ہماری جاں فدا ہے
کہ وہ کوئے صنم کا رہنما ہے

(۲) محمد جو ہمارا پیشوا ہے
محمد جو کہ محبوب خدا ہے

(۳) محمد کو برا کہتے ہو تم لوگ
ہماری جان و دل اس پہ فدا ہے

اسم و صفت کی یہ حسین تکرار اسی خلوص و جذبے اور والہانہ پن کا ردِ عمل ہے جو شاعر کی رگ و پے میں موجزن ہے۔ جذبات کی یہی شدت اور خلوص کی یہی فراوانی ان کی نظموں میں عظیم الشان تغزل کا لب و لہجہ پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر غزل کے تمام لوازمات اسی حسن و خوبی کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ جو غزل کی

روایت ہے۔ عشق الہی کا راز کے چند اشعار دیکھئے ؎

دل دے کے ہم نے ان کی محبت کو پا لیا
بے کار چیز دے کے قدر بے بہا لیا

نکلا تھا میں کہ بوجھ اٹھاؤں گا ان کا میں
لیکن انہی نے گود میں مجھ کو اٹھا لیا

ہونے دی ان کی بات نہ ظاہر کسی جگہ
جو زخم تھا رگا اسے دل میں چھپا لیا

عشق و وفا کا کام نہیں نالہ و فغاں
بھر آیا دل تو چپکے سے آنسو بہا لیا

ایک دوسری جگہ تغزل کی معراج ملاحظہ کیجیے ؎

وہ صحبتیں کہ نئی زندگی دلاتی تھیں
وہ آج میرے لئے کیوں بنی ہیں افسانہ

اسی ضمن میں اسید نا محمود کی نظم "ویرانوں کی آبادی" کے چند اشعار پڑھئے ان میں کیف و سرمستی کا عالم زیادہ جنوں خیز ہے۔ اور زیادہ والہانہ ہے۔ خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ خود نگری بھی لائق ستائش ؎

تعریف کے قابل ہیں یا رب تیرے دیوانے
آباد ہوئے جن سے دنیا کے ہیں ویرانے

سرمستی سے خالی ہے دل عشق سے عاری ہے
بیکار گئے ان کے سب ساغر و پیمانے

ہے ساعت سعد آئی اسلام کی جنگوں میں
آغاز تو ہیں کر دوں انجام خدا جانے

تضمین کا فن ایسا آسان نہیں جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ تضمین ایسے شعرا کے کلام پر کی جاتی ہے۔ جن کی عظمت مسلّمہ ہو اور جن کا فن نقد ہو۔ تضمین کا شوق دراصل ایک خود اعتمادی ہی کا رد عمل ہوتا ہے۔ ہر فطری شاعر غیر شعوری طور پر آئمہ فن کی ہم جلیسی کی کوشش کرتا ہے۔ خلوص اور جذبہ کی مستحکم بنیادیں ہی حقیقتاً اسی کوشش کی محرک ہوتی ہیں۔ تضمین کی کامیابی اسی میں ہے کہ شاعر کا کلام اقتباس پر چھا جائے۔ اور قاری خود غیر شعوری طور پر اقتباس اور ضمن میں موازنہ کرنا شروع کر دے۔ اور اپنی رائے نئے شاعر کے حق میں محفوظ کر لے۔ ذیل میں سیدنا حضرت محمود کی دو تضمین ملاحظہ فرمائیے ؎

میرے ہمراز کہتے ہیں کہ اک شے نور ہوتی ہے
جب آتی ہے تو تاریکی وہیں کافور ہوتی ہے
علاج رنج و غم ہائے دلِ رنجور ہوتی ہے
طبیعت کتنی ہی افسردہ ہو مسرور ہوتی ہے
"مگر ہم کیا کریں جن کے کہ دن بھی ہو گئے راتیں"

اقتباس کے شعر میں نور کا راتوں میں تبدیل ہونے کا ذکر ہے۔ مگر یہی ذکر جب صنعتی حسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضمن کے شعر میں ہوا۔ تو تاثر زیادہ گہرا ہو گیا۔ "تاریکی ـــــ کافور ہوتی ہے"۔ شعر کی ہیئت عشاق کے کس قدر روح افزا ہے۔ صنعت تطبیق میں عام طور پر ایک اختلافی شق ہوتی ہے۔ مگر یہاں

وہ موجود ہیں۔ کافور کا استعمال ذو معنی ہے تاریکی اگر کافور (اڑنا) ہوجائے۔ تو بھی دلنواز ہے۔ اور تاریکی اگر کافور (سفیدی) میں تبدیل ہوجائے۔ تو بھی دلربا۔
دوسری تضمین دیکھئے ؎

وہ خوش قسمت ہیں جو گرکے اس محفل میں جا پہنچے
کبھی پاؤں پہ سر رکھا کبھی دامن سے جا لپٹے
غرض جس طرح بن آئی مطالب ان سے منوائے
میرے ہمراز پر وہ پرشکستہ کیا کریں جن کے
"ہوا میں اڑ گئے نالے گئیں بیکار فریادیں"

مذکورہ بالا تضمین میں بھی مضمون کا ارتقاء بے حد حسین ہے۔ "جن کے" کا لفظ ایک ساحل سے مشابہ محسوس ہوتا ہے۔ جہاں سے تضمین کے مضمون کا دریا یک بیک تضمین کے معنوی سمندر میں جا گرتا ہے۔

سیدنا محمود کے کلام میں ہمیں جا بجا ایسے اشعار ملیں گے۔ جو "حسن بیان" اور "ندرت بیان" کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ ان کی نظم "نیرنگئ عشق" کے دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

عاشق کے آنسوؤں کی ذرا آب دیکھ لے
ہیرے کہاں ہیں لعل کہاں ہیں گہر کہاں
اے دل اسی کے در پہ بس اب جا کے بیٹھ جا
مارا پھروں گا ساتھ تیرے در بدر کہاں

دونوں شعر بے پناہ "حسن بیاں" لئے ہوئے ہیں اور زبان بھی کتنی سلجھی ہوئی

استعمال کی ہے۔ حُسنِ اظہار کی ایک اور مثال دیکھئے ؎

تکلیف میں ہوتا نہیں کوئی بھی کسی کا

احباب بھی کر جاتے ہیں اس وقت کنارہ

یہ شعر اپنے اندر واقعاتی سچائی اور نفسیاتی حقایق بھی رکھتا ہے جب انسان پر برا وقت آتا ہے۔ تو خود اس کے دیدہ و دل بھی اس کے کام نہیں آتے۔

لطف کنایہ اور تشبیہ و استعارہ شعر کی جان تصور کئے گئے ہیں۔ زیر تبصرہ کلام میں ہمیں یہ حُسن کئی مقامات پر ملے گا۔ فرماتے ہیں ؎

ہمیں بھی تجھ سے ہے نسبت اور نہ بادہ نوش

نگاہِ یار کو ہم بھی شراب کہتے ہیں

فراق میں جو مری آنکھ سے بہے تھے اشک

انہیں سے حسن نے پائی ہے آب کہتے ہیں

شعرِ ثانی میں حسن بیان و اظہار بھی اپنی نمائش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عاشق کی آنکھوں سے جو آنسو فراق میں بہتے ہیں۔ حُسن کی آب انہی سے ہی عبارت ہے۔ "آب" بمعنی چمک یہ اسلوب بالکل انوکھا ہے۔ اس سے پیشتر کسی شاعر نے آنسوؤں کو "حسن کی آب" نہیں کہا۔ الفاظ کی نشست و برخاست کو شعری دنیا میں بڑا دخل ہے۔ تخیل خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اگر الفاظ کی سیٹنگ ہی مناسب نہ ہو۔ تو بے فائدہ ہے۔ کلام محمود میں شعر کی یہ خوبی بھی بدرجہ اتم موجود ہے ؎

یہ جسم مرا سر سے پا تک جو معطر ہے

راز اس میں ہے یہ شاید وہ خواب میں آئے تھے

مطربِ عشق و محبت گوش بر آوازہ ہے

نغمۂ شیریں سنا دے ہاں سنا دے آج تُو

کس طرح تجھ کو گناہوں پہ ہوئی یوں جرأت

اپنے ہاتھوں سے کبھی زہر تو کھایا نہ گیا

سیدنا محمود کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ آپ محاورات اس انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا۔ کہ شعر محاورے کے لئے کہا گیا ہے شعر سے شعریت نہیں جانے دیتے۔ عبارت میں جھول پیدا نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ محاورہ شعر کی قیمت بڑھاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

راتیں تو ہوا کرتی ہیں راتیں ہی ہمیشہ!

پر ہم کو نظر آتے ہیں اب دن کو بھی تارے

محاسن شعر میں کیفیت کو بڑا دخل ہوا کرتا ہے۔ تمام ضروریات شعری کے باوجود اگر شعر کیفیت کا حامل نہ ہو تو قاری کے ذہن و دل پر اپنے تاثرات نہیں چھوڑے گا۔ کلام محمود میں ہر شعر ایک بھرپور کیفیت رکھتا ہے۔ میں مثال کے طور پر چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

ہیں وہ بے خود ہوں کہ تھے جس نے اڑائے میرے ہوش

مجھ کو خود وہ نگہِ ہوش ربا یاد نہیں

کوچۂ یار سے مجھ کو نکلنا دوبھر

کیا تجھے وعدہ ترا لغزشِ پا یاد نہیں

شعر اول میں دیکھئے "نگہِ ہوش ربا" ایک بھرپور کیفیت کا حامل ہے پہلے مصرعہ میں "تھے جس نے اڑائے میرے ہوش" میں ایک نا ہمہ کیفیت

ہے۔ جس کو محسوس کرنے والا خود بے خود ہو جاتا ہے۔ تو اندازہ کیجیے۔ کہ جس انسان پر یہ واردات گزری ہوگی۔ اُس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اسی طرح دوسرے شعر لغزش پا کو شعر سے نکال دیں۔ تو شعر کسی کام کا نہیں رہتا۔ لغزش پا نے شعر میں والہانہ تغزل اور بھرپور کیفیت پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں اور دیکھیے ؎

وہ لب سرخ ہیں گویائی پہ پھر آمادہ
سخت ارزاں مے گلفام ہوئی جاتی ہے

نگاہ لطف میری جستجو میں بڑھتی آتی ہے
ہوں وہ میخوار جس کے پاس خود میخانہ آتا ہے

ارتباط عاشق و معشوق کے سامان کر
پھر مری بگڑی بنا دے ہاں بنا دے آج تو

محمود راز حسن کو ہم جانتے ہیں خوب
صورت کسی کی نور کے سانچے میں ڈھل گئی

دیر کے بعد وہ ملے اٹھ کے ملے کیسے مگر
دل میں خوشی کی لہر تھی آنکھ سے اشکبار تھا

کلامِ محمود کی ادبی خوبیاں

ادب کی جامع و مانع تعریف کبھی بھی نہیں ہو سکی۔ کیونکہ تاریخ کی طرح ادب کی تحصیل علمی نامکمل ہے۔ ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ ادب میں انسانی افعال و اعمال کی تصویروں کا ابھرنا ناگزیر ہے انسان بے شمار سالوں سے ایک نہ ختم ہونے والے ارتقائی دور سے گذر رہا ہے۔ ہر لحظہ زندگی کی قدریں بدلتی ہیں۔ ایک حقیقت دوسری حقیقت کو جھٹلاتی ہے۔ یہ ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو کبھی بھی سکوت وجود کا شکار نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس سلسلہ میں کسی رکاوٹ کی توقع ہے۔ جب زندگی کی کوئی قدر بدلتی ہے۔ تو اس کا واضح عکس آئینہ حیات (ادب) میں دکھائی دیتا ہے۔ پھر ایک عکس دھندلا ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرا عکس ابھرتا ہے۔ اور اس طرح ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں مگر جس طرح زندگی کے کچھ اصول ایسے ہیں۔ جو صدیاں گذریں انسانیت نے قبول کر لئے۔ اور مسلسل تجرباتی عمل نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ لافانی ہیں۔ اسی طرح ادب کے بھی بعض اصول لافانی ہیں۔ ان اصولوں کی کوئی علیحدہ حیثیت نہیں۔ بلکہ یہ انہی تسلیم شدہ

اصولوں کا عکس ہیں۔

ان توجیہات کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ دورِ حاضر کے ایک ادیب کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی صالح اقدار کا ایمانداری اور غیر جانبداری سے ساتھ دے۔ وہاں ان عالمی سچائیوں (UNIVERSAL TRUTH) کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ جو سالہا سال سے انسان کے لئے مفید ثابت ہوئیں، اور جنہوں نے معاشرتی نظام کو سنبھالا دیا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ قوموں کی ترقی اور خوشحالی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ جس قوم نے عمل کیا۔ اس نے اپنے مقاصد کو پا لیا۔ حضرت سیدنا محمود فرماتے ہیں ؎

ہے عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی
جا لپٹ جا لہر سے دریا کی کچھ پروا نہ کر

انسان کو مقاصدِ حیات حاصل کرنے کے لئے عمل کی ضرورت ہے۔ جو آدمی عمل کرتا ہے۔ وہ کامیاب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں خلوص شامل ہو۔ اور اگر اس جدوجہد میں کام آ جاتا ہے۔ تو بھی ایک دائمی اور لافانی حیات پاتا ہے۔

محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ اس پر مختلف ادا ہماری نظر سے گذری ہیں لیکن حضرت محمود کس خوش اسلوبی اور بلند نظری سے محبت کا

تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

ہے محبت ایک پاکیزہ امانت اے عزیز
عشق کی عزت ہے واجب عشق سے کھیلا نہ کر

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

ان کو اظہار محبت سے ہے نفرت محمود
آہ میری یونہی بدنام ہوئی جاتی ہے

مختلف شعراء نے اس موضوع پر اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ محبت چھپائے نہیں چھپتی۔ جس طرح کہ مشک کی خوشبو چھپائی اور دبائی نہیں جاسکتی

سیدنا حضرت محمود اس سلسلے میں ہماری روزمرہ کی زندگی سے قریب ترین واقع کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آگ ہوگی تو دھواں اس سے اٹھے گا محمود
غیر ممکن ہے کہ ہو عشق پہ اعلان نہ ہو

یہ وہ حقایق ہیں۔ جو کبھی اور کسی دور میں تبدیل ہوئے اور نہ ہوں گے۔ زیر غور کلام میں ہمیں جابجا ایسے حقایق ملتے ہیں جو نہ تبدیل ہونے والے ہیں اور نہ ختم ہونے والے۔

ادب پر گہری نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعلیٰ لٹریچر کے مندرجہ ذیل لوازمات ہیں۔

(۱) خلوص جذبات (۲) شدت احساس
(۳) عام فہم (۴) خیالات کا غیر تصنع پن

(۵) مثبت اور منفی اقدار کی موجودگی

(۶) معاشرے کی عکاسی

کسی ادیب یا شاعر کی ذہنی کاوش کو پرکھنے کے لئے مندرجہ بالا اصولوں کا ایک معیار بنانا پڑے گا۔ سید نا محمود کے کلام کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اس معیار پر مکمل طور پر پورا اترتا ہے۔ میں اس دعوے کے ثبوت میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں ؎

دنیا تجھ سے میری شہرت نہیں برعکس ہے قصہ

تیری ہستی تو مجھ سے ہے نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

شعر عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ شدت جذبات و احساس رکھتا ہے۔ خیالات تصنع سے پاک ہیں۔ مثبت اور منفی اقدار برابر ساتھ دے رہی ہیں۔ مصرعۂ اول میں ایک بات کہہ کر مصرعۂ ثانی میں اسی کا دوسرا رخ بیان کرنے کا اسلوب قابل ستائش ہے۔ حضور کا دوسرا شعر سنئے ؎

وصل کا لطف تبھی ہے کہ رہیں ہوش بجا

دل بھی قبضہ میں رہے پہلو میں دلدار بھی ہو

مولانا حسرت موہانی، اردو غزل جن کی مرہون منت ہے فرماتے ہیں ؏

ہوش و حواس کچھ نہیں اتنے ہیں ہوشیار ہم

محبوب کی موجودگی شاعر کو بے ہوش و حواس بنا دیتی ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ اسے ہوش نہیں، کیونکہ وہ تاب نظارہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح بہزاد لکھنوی کا مشہور شعر جو گنتی کے ان شعروں میں سے ہے جنہوں نے بہزاد کو سنبھالا دیا ؎

ہائے بہزاد یہ عالم نہ سمجھ میں آیا
اب مجھے ہوش جو آیا تو انہیں ہوش نہیں

میں یہاں ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات سے سوال کرتا ہوں۔ کہ وہ مفہوم جو حضرت اقدس کے شعر میں ہے کیا اس سے پیشتر کسی شاعر نے بیان کیا ہے ؟

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے یقیناً نہیں کیا گیا وصل کا حقیقی لطف اسی میں ہے کہ پہلو میں دل رہے اور جذبات کی شدت اس پر غالب نہ آنے پائے اور انسان ہوش و حواس بھی کھونے نہ پائے۔

جناب بیدم وارثی ایک صوفی شاعر گذرے ہیں۔ اُن کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

روح زنجیر کے رونے کی صدا آتی ہے
کوئی زندانِ محبت سے رہا ہوتا ہے

حالانکہ زندانِ محبت سے رہائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ملاحظہ کیجئے۔ کہ یہ ایک صوفی شاعر فرما رہے ہیں۔ جن کا عشق خدا تعالےٰ سے ہے ۔ کسی حد تک رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی اس مسئلے میں کامیاب نظر آرہے ہیں کہتے ہیں ؎

رہائی ہو نہیں سکتی کبھی قید تعلق سے
جو اک زنجیر ٹوٹی دوسری زنجیر دیکھیں گے

اس شعر میں جذبات اور احساسات تو موجود ہیں لیکن اس کے علاوہ بہت سی تشنگی رہ گئی ہے جس کو سلطان البیان حضرت محمود پورا فرماتے ہیں ؎

مجھے قید محبت لاکھ آزادی سے بہتر ہے

کچھ ایسا کر کہ پابند سلاسل ہی رہوں ساقی

یہاں "ساقی" سے مراد ساقیِ ازل ہے۔ اور یہی محبت کی معراج یہاں تک مجبور کرتی ہے کہ حضور فرماتے ہیں ؎

نہ مے رہے نہ رہے خم نہ یہ سبو باقی
بس ایک دل میں رہے تیری آرزو باقی

شکایتیں ہیں ہزاروں بھری پڑی دل میں
رہی بھی ایک نہ پر اُن کے روبرو باقی

محبت کی یہ اعلیٰ اور ارفع اقدار آخر یہ رنگ لاتی ہیں ؎

شکرِ خدا گذر گئی ہے ناز و نیاز میں ہی عمر
مجھ کو بھی اُن سے عشق تھا اُن کو بھی مجھ سے پیار تھا

دنیائے آب و گل کے متعلق مختلف آرا ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جرمنی کا مشہور فلاسفر ہینس فلی ہینگر کہتا ہے۔ کہ دنیائے رنگ و بو ایک دھوکا ہے فریب خیال ہے۔ ہندوستان کا قدیم فلاسفر غالباً اس کا نام "پرہو" تھا۔ جو سکندر اعظم کے حملے کے وقت زندہ تھا۔ دنیا کو مایا کا ایک جال کہتا ہے۔ لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں۔ دنیا نہ تو فریب خیال ہے نہ مایا کا جال۔ بلکہ اس کی تشریح حضرت محمود اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

حسن فانی سے نہ دل کاش لگائے کوئی
اپنے ہاتھوں سے نہ خاک اپنی اڑائے کوئی

مادیت پرست لوگوں کے نزدیک گو اس نشعر کا کوئی مقام نہیں لیکن روحانیت کے علمبردار جن سے اس کائنات کا نظام عبارت ہے۔ اس نسحر کی اقدار کا اندازہ کر سکتے ہیں:

کلام میں علم معرفت و حقیقت

علم کی عظمت اور قدر کا تعین کرنے کے سلسلے میں کیا یہ دلیل کچھ کم ہے۔ کہ تمام انبیاء و رسل نے اللہ تعالیٰ سے مختلف چیزیں مانگیں۔ لیکن حضرت محمد صلعم کو ارشاد ہوا کہ "قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً" (اے میرے پروردگار مجھے زیادہ سے زیادہ علم عنایت فرما"

علم کسی چیز کی حقیقت کا ادراک ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ نظری، عملی اور عقلی ہے۔ علم کی معراج میرے نزدیک "علم معرفت و حقیقت" ہے۔ یعنی خدا اور اس کی بنائی ہوئی کائنات کو پہچاننا اور اس کا تجزیہ کرنا۔

انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اہل دنیا اسباب دنیا کی فراہمی میں مشغول ہوتے ہیں اور اہل عقبیٰ زہد و عبادت میں۔ اہل عقبیٰ گو دنیاوی معاملات سے بھی بے خبر نہیں ہوتے تاہم ان کے نزدیک ان کا مقصد حیات زہد و عبادت ہی ہوا کرتا ہے

اہل دنیا سے میری مراد یہاں اہل طمع انسان سے ہے۔ جو مارا مارا پھرتا ہے۔ اور اس کی نگاہیں ہمیشہ دنیاوی لذتوں کی طلبگار ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کو دین پر مقدم رکھتا ہے یہ دنیاوی لذات اس کے دل میں دنیا کی محبت بڑھا دیتی ہیں۔ اور آخرت کا خیال تک

اس کے ذہن میں نہیں آنے دیتیں۔ اور آخرت کی نعمتوں سے محروم کر دیتی ہیں۔
دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی عظمت اور پائداری کا نقشہ کھینچتے ہوئے سیدنا
حضرت محمود کس خوش اسلوبی سے فرماتے ہیں ؎

حُسنِ فانی سے نہ دل کاشن لگائے کوئی
اپنے ہاتھوں سے نہ خاک اپنی اڑائے کوئی

ایک دوسری جگہ حُسنِ دنیا کے مقابلے میں حُسنِ حقیقی کی تشریح فرماتے ہوئے
حضور فرماتے ہیں ؎

ساغرِ حُسن تو پُر ہے کوئی میخوار بھی ہو
ہے وہ بے پردہ کوئی طالب دیدار بھی ہو

اس شعر میں ان لوگوں کے لئے ایک پیغام ہے۔ جن کا دعویٰ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ
کو پانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یعنی حسن
حقیقی تو موجود ہے۔ مگر دیکھنے والی نگاہیں موجود نہیں۔ اگر ایسی آنکھ موجود ہو تو آسانی سے
دیکھ سکتی ہے اور فیض حاصل کر سکتی ہے۔

دنیاوی لوگوں جن کی تشریح میں اوپر بتا آیا ہوں، کے ظرف اور نگاہیں ہی اس
مقام کو نہیں پا سکتیں۔ اور نہ ہی ان میں "دید" کا حقیقی شوق ہوتا ہے۔ ورنہ شوق دید
رکھنے والی آنکھ تو یقیناً حسن حقیقی کو دیکھ ہی لے گی۔ حضرت محمود فرماتے ہیں ؎

دید کا شوق اسے ڈھونڈھ ہی لے گا آخر
لاکھ پردہ میں بھی گو خود کو چھپائے کوئی

نگاہیں حقیقی جستجو ہونی چاہیئے حسن حقیقی کو دیکھنا اور پانا کوئی مشکل نہیں۔

علم معرفت و حقیقت کے حصول کے لیئے ضروری ہے۔ کہ انسان مجموعی طور پر خدا تعالے پر بھروسہ کرے اور جد و جہد سے غافل نہ رہے۔ خدا تعالیٰ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے انسان اپنے اندر تسلیم و رضا، صبر و شکر، قناعت۔ گناہوں پر پشیمانی اور خوف الٰہی پیدا کرے۔ رنج و عداوت اور دوسری بری عادتوں کو ترک کرے۔ ذکر الٰہی پہ زور دے۔ تو خدا تعالے اپنی محبت اور قربت کے دروازے اس پر بتدریج وا کرتا چلا جائے گا۔ اور اپنی نصرت کو اس کی امداد کے لئے نازل فرمائے گا۔ یہ تمام حقائق سیدنا حضرت محمود اپنے کلام میں ارشاد فرماتے ہیں۔ چند مثالیں بغیر کسی تبصرے کے پیش کرتا ہوں ؎

کام دیتی ہے عصا کا آیت لَا تَقْنَطُوْا
ورنہ عصیاں نے تو میری توڑ ڈالی تھی کمر

کوئی مجھ سا گناہوں پر پشیماں ہو نہیں سکتا
کوئی یوں غفلتوں پر اپنی گریاں ہو نہیں سکتا

چھوڑ دو رنج و عداوت ترک کر دو بغض و کیں
پیار و الفت کو کرو تم جان و دل سے اختیار
دونوں ہاتھوں سے پکڑ لو دامنِ تقویٰ کو تم
ایک ساعت میں کرا دیتا ہے یہ دیدارِ یار
الغرض یہ عشقِ مولیٰ بھی عجب اک چیز ہے
جو گداگر کو بنا دیتی ہے دم میں شہر یار

گنہ کے بعد ہو توبہ سے باب رحمت وا
خطا کے بعد ہے انفعال میں برکت

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو زور دعا دیکھو تو

صبر کر اے ناقۂ راہ ہدیٰ ہمت نہ ہار
دور کر دے گی اندھیروں کو ضیائے تادیاں

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ تنہا ہی نہیں۔ بلکہ تمام عالم انسانی کو زندگی کے اعلیٰ ترین مقام پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اور وہ تمام اسلوب اور طریقے بتاتے ہیں جو قربت الٰہی کے موجب ہوتے ہیں۔ یہی ایک عظیم انسان کا حق ہوتا ہے۔ سیدنا محمود انسانی قافلے کو اپنے ساتھ ساتھ اعلیٰ وارفع مقامات پر لے جانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی کہتے ہیں ؎

ہم سفر سنبھلے ہوئے آنا کہ ہے رستہ خراب
پر قدم ڈھیلا نہ ہو میں تیز رفتاروں میں ہوں

علم معرفت و حقیقت کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ انسان اس کے حصول کے بعد اہل دنیا سے غافل ہو جائے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر زندگی گزار دے۔ بلکہ اس پر اصلاح اخلاق و عادات انسانی بھی فرض ہو جاتی ہے۔ یہاں میں ضروری خیال کرتا ہوں۔ کہ چند صوفی "

شعرا یعنی ان شعرا کے کلام کے کچھ نمونے پیش کروں جنہیں متصوف شاعری کے علمبردار کہا جاتا ہے۔ ان مثالوں کے ساتھ ساتھ میں اس تشنگیٔ نظریات کا ذکر بھی کرتا جاؤں گا۔ جو ان میں موجود ہے۔ مولانا جامی رہ فرماتے ہیں ؎

آسودگی بگوشۂ عزلت نشستن است
سر رشتۂ امید ز عالم گسستن است
پہلو تہی نمودن روشن دلاں ز خلق
بہر روئے زنگیاں دیہ آئینہ بستن است

ان اشعار میں ہمیں تنہائیوں کے گوشوں میں رہ کر آسودگی تلاش کرنی ہے اور ترغیب دی گئی ہے کہ کائنات سے تمام تعلقات منقطع کر لینے چاہئیں۔

جناب بیدم وارثی کہتے ہیں ؎

یہ کہہ کے مجھ کو لئے جا رہا ہے شوق سجود
کہ آج سر نہیں یا آستانِ یار نہیں

عشق الٰہی کا دعوےٰ کرنے والے شاعر کے اس شعر کو پڑھ کر خود فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ اسلوب بیان گستاخیوں کی حدوں تک نہیں پہنچ گیا

اصغر گونڈوی کہتے ہیں ؎

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں
اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

اصغر گونڈوی اردو شاعری کے صوفی شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ محبوب کو یعنی محبوب حقیقی کو پانے کے بعد محویت کی کیفیت سمجھ میں نہیں آتی۔

مندرجہ بالا مثالوں کے بعد یہ کہنا ہی پڑتا ہے ؎

غرض یہ علم اک آغاز بے انجام ہے ساقی
ابھی تک ذہن میں ابہام ہی ابہام ہے ساقی

اس کے برعکس میں حضرت محمود کے اشعار کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں ؎

سجدہ کا اذن دے کے مجھے تاجور کیا
پاؤں تیرے کہاں مرا ناچیز سر کہاں

ممکن کہاں کہ غیر کرے مجھ سے ہمسری
وہ دل کہاں وہ گردے کہاں وہ جگر کہاں

مضطرب ہو کے چلے آتے ہیں میری جانب
موت ہی وصل کا پیغام ہوئی جاتی ہے

تیرے در پر ہی میری جان نکلے
خدایا یہ میرا ارمان نکلے

کوئی دشمن اسے کر سکتا نہیں مجھ سے جدا
ہے تصور تیرا دل میں کوئی تصویر نہیں

نظر آ رہا ہے وہ جلوۂ حسن ازل کا شمع حجاز میں
کہ کوئی بھی اب تو مزا نہیں رہا قیس عشق مجاز میں

سینہ میں جوشِ غیرت اور آنکھ میں حیا ہو
لب پر ہو گو کہ تیرا دل میں تیری وفا ہو

محمود کر کے چھوڑیں گے ہم حق کو آشکار
روئے زمین کو خواہ ہلانا پڑے ہمیں

سید الانبیاء کی امت کو
جو ہوں غازی بھی وہ نمازی بخش
دست کوتاہ کو پھر درازی بخش
خاکساروں کو سرفرازی بخش
کفر کی چیرہ دستیوں کو مٹا
دستِ اسلام کو درازی بخش

سیدنا حضرت محمود ان تمام مراحل سے گذر کر محبت حقیقی کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں عاشق و محبوب میں راز و نیاز شروع ہو جاتا ہے۔

مجھے یہاں یاد آ گیا۔ کہ حضور اقدس نے ۱۹۵۲ء کے جلسہ سالانہ پر اپنی تقریر "تعلق باللہ" میں اپنا ایک واقعہ بتایا تھا۔ کہ ابتدائی ایام خلافت میں حضور اقدس کو ایک مشکل پیش آئی۔ آپ نے دعائیں کیں مگر کام نہ ہوا۔ آپ نے فیصلہ کیا جب تک

خدا تعالیٰ میری بات نہ مانے گا میں چارپائی پر نہیں سوؤں گا۔ چنانچہ رو دیا میں خدا انہیں ملا اور ان کی مشکل آسان ہوئی۔ میرا مدعا اس واقعہ کے بتلانے سے یہ ہے۔ کہ یہ مقام بھی عاشق و معشوق کے مابین آتا ہے۔ جیسا کہ حضور۔ اپنی نظم "وفادار عاشق" میں فرماتے ہیں ؎

خواہ تم کتنا ہی ڈانٹو　　خواہ تم کتنا ہی کوسو
خواہ تم کتنا ہی جھڑکو　　میں تمہیں جانے نہ دونگا
میں تمہیں جانے نہ دوں گا

تم ہو میری راحت جاں　　تم سے وابستہ ہیں ارماں
زور سے پکڑوں گا داماں　　میں تمہیں جانے نہ دوں گا
میں تمہیں جانے نہ دوں گا

دل میں رکھوں گا چھپا کر　　آنکھ کی پتلی بنا کر
اپنے سینے سے لگا کر　　میں تمہیں جانے نہ دوں گا

خود اعتمادی

انسان میں اگر خود اعتمادی کا جوہر ہو۔ تو وہ بڑی آسانی سے منفی کو مثبت میں بدل سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا دانش آمیز جوہر ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ذہن اور دل ایک ابدی سکون سے ہمکنار رہتے ہیں۔ اور وہ مشکلیں جو انسان کی راہوں میں حائل ہوتی ہیں۔ وہ اسی جوہر کی بدولت انسان کے لیے نئے نئے راستے تراش لاتی ہیں۔ جس وقت کسی انسان کے سامنے کوئی مشکل مرحلہ درپیش ہو جو ایک عام نظر میں ناقابل حل ہو۔ مگر انسان کا ذہن اس نکتہ پر سوچے کہ وہ قابل حل ہے تو اسی مقام فکر سے اعتماد کا جوہر گرانمایہ پیدا ہوتا ہے۔ جسے ذہن انسانی اپنا لیتا ہے۔ اور ہر مشکل مسئلہ آسان ہو جاتا ہے یہی خود اعتمادی ہے۔ اس کے متعلق ماہرین نفسیات نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ انہی خطوط پر کہا گیا ہے۔

سیدنا حضرت محمود کے کلام میں خود اعتمادی کا جذبہ عام ملتا ہے لیکن یہ جذبہ نفسیاتی اعتبار کے علاوہ روحانی اقتدار کا بھی حامل ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری میں بعض مقامات پر خود اعتمادی کا جذبہ اتنا بلند ہوتا ہے۔ کہ حکم کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ تمام اس لئے کہ آپ بلحاظ مرتبہ عام انسانوں سے بلند ہیں۔ آپ کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ آپ طالب حق کو ارشاد فرماتے ہیں

ان سے ملنا ہو گر تو ہم سے مل
وصل کی راہوں کے موڑ ہیں ہم

ایک اور جگہ فرماتے ہیں لیکن مشروط طور پر سے

تیرے در کی گدائی سے بڑا ہے کون سا درجہ
مجھے گر بادشاہت بھی ملے تو میں نہ لوں ساقی

پلائے تو اگر مجھ کو تو میں اتنی پیوں ساقی
رہوں تا حشر مدہوش میں تیرے میں سرنگوں ساقی

آپ خود اعتمادی کو بصیرت کی آنکھ عطا کرتے ہیں۔ اور اس آنکھ سے مشاہدہ کرتی ہے
آپ اس مشاہدے کو خود اعتمادی کے قالب میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں سے

شہیدانِ محبت سے ہی میخانے کی رونق ہے
چھلکتا ہے ترے پیمانہ میں ان کا ہی خوں ساقی

کہیں کہیں آپ کے کلام میں آپ کی خود اعتمادی استغنا کو بھی ابھارتی ہے۔ ایسا
استغنا جو منطقی زبان میں خودداری کی ایک ترقی یافتہ مثال ہے سے

میں وہ مجنوں ہوں کہ جس کے دل میں گھر ہے یار کا
اور ہوگا وہ کوئی جس کو ہے محمل کی تلاش

پھیلائیں گے صداقت اسلام کچھ بھی ہو
جائینگے ہم جہاں بھی کہ جانا پڑے ہمیں

خود اعتمادی بعض اوقات ذہن کو وہ صفات بھی عطا کرتی ہے جنہیں عرف عام
میں بے نیازی کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی عکاسی بھی ایک نہایت ہی موثر انداز میں ملاحظہ
کیجئے سے

گر زندگی دینی ہے تو دے ہاتھ سے اپنے ؛ کیا جینا ہے یہ جیتے ہیں غیروں کے سہارے

حسن طلب اسی طرح خود اعتمادی کا عکس اوڑھے کہتا ہے ؎

تو بارگاہِ حسن ہے میں ہوں گدائے حسن

مانگوں گا بار بار میں تو بار بار دے

اسی طرح خود اعتمادی کو ایک عجیب رنگ میں ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

آ جاتے ہو تم یاد تو لگتا ہوں تڑپنے

ورنہ کسے آرام سے سونا نہیں آتا

وصل محبوب کی ساعت جب قریب آتی ہے۔ تو ہوش و حواس کا بجا رہنا قرین قیاس ہی نہیں۔ یہ ایسا مقام ہے۔ جہاں عقل رسا بھی فہم نارسا بن جاتی ہے۔ لیکن حضرتِ محمود اس مقام وصل کو اور اس اضطراب کی کیفیت کو جو ذہن کے لئے مہلک ہے۔ اس طرح کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جتنی بڑی خود اعتمادی آپ کے پاس ہے۔ اس کی مثال ملنا محال ہے۔ فی الحقیقت ایسی خود اعتمادی اور اتنی خود اعتمادی عظیم انسانوں کا ہی حصہ ہے۔ شعر سنئے ؎

ساعت وصل آ رہی ہے قریب

ہو رہے ہیں بجا حواس میرے

حضور اپنی خود اعتمادی کے مقابلے میں دنیا کی خود اعتمادی کو جانچتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں ؎

گاتے ہیں جب فرشتے کوئی نغمۂ جدید

ہاتھوں میں تھام لیتے ہیں فوراً ہی سازہم

آ تمہیں بتائیں محبت کے راز ہم ؛ چھیڑیں تمہاری روح کے خوابیدہ سازہم

مدعا

اپنے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ میں نے اپنے ذہن ناقص سے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد (خلیفۃ المسیح الثانی) کے کلام پر اس ارادہ سے تبصرہ کیا ہے کہ عوام الناس آپ کے کلام کی داخلی کیفیت اور خارجی اثرات سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ اور اس سے وہ اپنی زندگی کے لئے فلاح و بہبود کی حقیقی راہ اختیار کریں۔ جیسا حضور خود اپنے کلام کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

"چونکہ میں تکلف سے شعر نہیں کہتا۔ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔ پڑھو اور غور کرو۔ خدا کرے یہ درد بھرے کلمات کسی امید روح کے لئے مفید اور بابرکت ہوں"

(حکیم) محمد شفیع۔ ادارہ کتابت۔ ریلوے روڈ۔ لاہور